رسائل و مسائل

اسلامی جمہوریت اور ملازمینِ حکومت کی حیثیت

سوال۔ اگست ۱۹۶۰ء کے "ترجمان" میں اشارات کے زیرِ عنوان آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن سے مجھے جزوی اختلاف ہے۔ میرے شبہات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ آپ نے جمہوریت کو قرآن و سنت کا منشاء قرار دیا ہے۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ فی زمانہ جمہوریت ایک مخصوص طرزِ حکومت کا نام ہے جس کی بنیاد عوام کی غیر محدود حاکمیت کے تصور پر قائم ہے۔ جسے ہم کسی طرح بھی کتاب و سنت کے منشاء کے مطابق قرار نہیں دے سکتے۔ آپ جمہوریت کے لفظ کو اس کے معروف معنی سے ہٹا کر استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نے خود اسلامی طرزِ حکومت کے لیے تھیوڈیماکریسی کی اصطلاح وضع کی تھی، اب اس اصطلاح کو چھوڑ کر آپ ڈیماکریسی کی طرف کیوں رجعت کر رہے ہیں؟

۲۔ آپ کا یہ خیال کہ ملازمینِ حکومت کو سیاسیات میں دخل انداز نہ ہونا چاہیے، بالکل مبہم اور مجمل ہے۔ کیا آپ بھی سیاسیات و مذہب کی مصنوعی تقسیم کے قائل ہیں۔

۳۔ آپ کا یہ کہنا بھی تعلیماتِ اسلامی کے مطابق نہیں کہ سرکاری ملازم ہر اس ہیئتِ حاکمہ کی اطاعت قبول کریں جسے ملک کے باشندوں کی اکثریت آئینی طور پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔ مسلمان کے لیے خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا عام شہری، اطاعت صرف اسی حکمران کی لازم ہے جو کتاب و سنت کا پابند ہو۔ محض آئینی حیثیت سے ملک کی مسندِ اقتدار پر متمکن ہو جانا کسی طرح بھی مسلمانوں سے اطاعت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جواب: جمہوریت کے متعلق میں بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت کا اصل جوہر موجود ہے مگر جمہوریت کے اسلامی تصور اور جمہوریت کے مغربی تصورات

میں بڑا فرق ہے۔ اسلام عوام کی لامحدود حاکمیت کا قائل نہیں ہے، بلکہ خدا کی حاکمیت کے تحت عمومی خلافت کا قائل ہے۔ اس عمومی خلافت کے اختیارات چونکہ کسی شخص یا خاندان یا گروہ میں مرکوز نہیں ہوتے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری ملّت کو حاصل ہوتے ہیں اور وہی اس کی مجاز ہے کہ جس کو چاہے ان اختیارات کے استعمال کے لیے منتخب کرے، اس لیے شخصی اور گروہی حکومت سے ممتاز کرنے کے لیے اسلام کے طرزِ حکومت کو جمہوری حکومت کہا جا سکتا ہے۔ یہی اسلام کا مخصوص تصورِ جمہوریت ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کا ایک ہی معروف اور متفق علیہ تصور رائج ہے۔ مغرب میں بھی جمہوریت کے مختلف تصورات، مثلاً سرمایہ دارانہ جمہوریت، اشتراکی جمہوریت وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے بالمقابل اسلام کے طرزِ حکومت کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی اسلامی جمہوریت کو میں نے تھیوڈیماکریسی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس اصطلاح سے بھی مراد جمہوریت ہی کی ایک قسم ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔

ملازمینِ حکومت کے سیاسیات میں دخل انداز ہونے کی جو مخالفت میں نے کی ہے اس کے وجوہ و دلائل بھی میں نے بیان کر دیے ہیں۔ آپ نے ان دلائل پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور ایسے پہلوؤں سے اعتراضات شروع کر دیے جو اصل معاملہ سے غیر متعلق ہیں۔ ملازمینِ حکومت کی ایک حیثیت ذاتی ہے اور دوسری حیثیت ملازمِ حکومت ہونے کی ہے۔ ذاتی حیثیت میں کوئی بھی نہیں کہتا کہ وہ سیاست سے "علیحدہ" رہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کو بھی عام لوگوں کی طرح ووٹ کا حق حاصل ہے۔ لیکن ملازمِ حکومت ہونے کی حیثیت سے ان کا سیاست میں "دخل انداز" ہونا اور ان سرکاری اختیارات کو، جو انتظامِ ملکی کے لیے انہیں دیے گئے ہیں، سیاسی نظریوں اور پارٹیوں میں سے کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف استعمال کرنا، اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی ملک کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ کیا آپ اسے صحیح سمجھتے ہیں کہ پولیس اور فوج اور سول سکریٹریٹ کے لوگ اپنی جتھہ بندی کر کے خود اپنا ایک نظریہ قائم کر لیں اور یہ فیصلہ کر بیٹھیں کہ وہ خود ملک پر قبضہ کر کے اپنے نظریے کو زبردستی نافذ کریں گے یا کوئی ایسی پارٹی اگر انتخابات کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آجائے جو ان کے نظریہ سے مختلف نظریہ رکھتی ہو تو اس کی حکومت نہ چلنے دیں؟

یہ صحیح ہے کہ ایک سرکاری ملازم کو، ایک عام شہری کی طرح، صرف اسی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیے

جو کتاب و سنت کا پابند ہو، لیکن کیا یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کوئی حکمران کتاب و سنت کا پابند نہ ہو تو اس کی ملازمت تو کی جائے مگر اطاعت نہ کی جائے ؟ میں نے تو جس سیاق و سباق میں یہ بات کہی تھی کہ باشندوں کی اکثریت جس ہیئت حاکمہ کے سپرد اختیارات کرے اس کی اطاعت ملازمین کو کرنی چاہیئے اس میں جمہوری اصول بیان کرنے سے پہلے اسلامی دستور کے اصول بھی بیان کر چکا تھا اور میری یہ بات اسی سیاق و سباق سے متعلق سمجھی جانی چاہیئے تھی۔ لیکن اگر آپ اس سیاق و سباق سے الگ کر کے بھی اسے لیں تو میں کہوں گا کہ ملک کی اکثریت اگر کسی ایسی ہیئت حاکمہ کو اختیارات سونپ دے جو کتاب و سنت سے منحرف ہو تو ایک دیندار ملازم حکومت کو استعفاء دے دینا چاہیئے۔ بہرحال اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ملازمت تو کرتا رہے مگر اطاعت سے انکار کر دے۔

ناقابلِ توجیہ حوادثِ حیات

سوال:۔ انسانی زندگی میں بہت سے واقعات و حوادث ایسے رونما ہوتے رہتے ہیں کہ جن میں تخریب و فساد کا پہلو تعمیر و اصلاح کے پہلو پر غالب نظر آتا ہے۔ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی حکمت و مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر زندگی کا یہ تصور ہو کہ یہ خود بخود کہیں سے وجود میں آگئی ہے اور اس کے پیچھے کوئی حکیم و خبیر اور رحیم طاقت کارفرما نہیں ہے اتب تو زندگی کی ہر پریشانی اور اُلجھن اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ اس کو پیدا کرنے میں کسی عقلی وجود کو دخل نہیں ہے، لیکن مذہب اور خدا کے بنیادی تصورات اور ان واقعات میں کوئی مطابقت نہیں معلوم ہوتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان مسائل کے حل کرنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، تو یہ چیز بھی عجیب ہے کہ ذہن انسانی کو ان سوالات کی پیدائش کے قابل تو بنا دیا جائے، لیکن ان کا جواب دینے یا سمجھنے کے قابل نہ بنایا جائے، اور سب ضروریات کا خیال رکھا جائے مگر ان ذہنی ضروریات کو نظرانداز کر دیا جائے۔ اس طرح تو خالق کی پالیسی میں بظاہر جھول معلوم ہوتا ہے (نعوذ باللہ)

جواب۔ آپ جن الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں ان کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے کہ میں ان کو سلجھانے کی اہمیت نہیں رکھتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک آپ کی فکر کا نقطۂ آغاز صحیح نہیں ہے۔ آپ جن سوالات سے غور و فکر کا آغاز کرتے ہیں وہ بہر حال کُلّی سوالات نہیں ہیں بلکہ کُل کے بعض پہلوؤں سے متعلق ہیں اور بعض سے کُل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ آپ پہلے کُل کے متعلق سوچیے کہ آیا یہ بغیر کسی خالق اور ناظم اور مدبر کے موجود ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر خلق بے خالق اور نظم بے ناظم کے وجود پر آپ کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے تو باقی سب سوالات غیر ضروری ہیں، کیونکہ جس طرح سب کچھ الل ٹپ بن گیا اسی طرح سب کچھ الل ٹپ چل بھی رہا ہے۔ اس میں کسی حکمت، مصلحت، اور رحمت و ربوبیت کا کیا سوال۔ لیکن اگر اس چیز پر آپ کا دل مطمئن نہیں ہوتا تو پھر کُل کے جتنے پہلو بھی آپ کے سامنے ہیں ان سب پر بحیثیت مجموعی غور کر کے یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ ان اشیاء کی پیدائش، ان کا وجود، ان کے حالات اور ان کے اوصاف میں ان کے خالق و مدبر کی کن صفات کے آثار و شواہد نظر آتے ہیں۔ کیا وہ غیر حکیم ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے علم و بے خبر ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے مصلحت اور بے مقصد اندھا دھند کام کرنے والا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے رحم اور ظالم اور تخریب پسند ہو سکتا ہے؟ اس کے کام اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بنانے والا ہے یا اس بات کی کہ وہ بگاڑنے والا ہے؟ اس کی بنائی ہوئی کائنات میں صلاح اور خیر اور تعمیر کا پہلو غالب ہے یا فساد اور شر اور خرابی کا پہلو؟ ان امور پر کسی سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی غور کیجیے اور خود رائے قائم کیجیے۔ اگر بحیثیت مجموعی اپنے مشاہدے میں آنے والے آثار و احوال کو دیکھ کر آپ یہ محسوس کریں کہ وہ حکیم و خبیر ہے، مصلحت کے لیے کام کرنے والا ہے، اور اس کے کام میں اصل تعمیر ہے نہ کہ تخریب، تو آپ کو اس بات کا جواب خود ہی مل جائے گا کہ اس نظام میں جن جزوی آثار و احوال کو دیکھ کر آپ پریشان ہو رہے ہیں وہ یہاں کیوں پائے جاتے ہیں۔ ساری کائنات کو جو حکمت چلا رہی ہے اس کے کام میں اگر کہیں تخریب کے پہلو پائے جاتے ہیں تو لامحالہ وہ ناگزیر ہی ہونے چاہئیں۔ ہر تخریب تعمیر ہی کے لیے مطلوب ہونی چاہیے۔ یہ جزوی فساد کُلّی صلاح ہی کے لیے مطلوب ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ ہم اس کی ساری مصلحتوں کو کیوں نہیں سمجھتے تو بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ہم ان کو نہیں سمجھتے۔ یہ بات نہ میرے

بس میں ہے اور نہ آپ کے بس میں کہ اس امر واقعی کو بدل ڈالیں۔ اب کیا محض اس لیے کہ ہم ان کو نہیں سمجھتے، یا نہیں سمجھ سکتے، ہم پر یہ جھنجلاہٹ طاری ہو جانی چاہیے کہ ہم حکیم و خبیر کے وجود ہی کا انکار کر دیں؟ آپ کا یہ استدلال کہ "یا تو ہر جزوی حادثے کی مصلحت ہماری سمجھ میں آئے، یا پھر اس کے متعلق کوئی سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہی نہ ہو، ورنہ ہم ضرور اسے خالق کی پالیسی میں جھول قرار دیں گے کیونکہ اس نے ہمیں سوال کرنے کے قابل تو بنا دیا لیکن جواب معلوم کرنے کے ذرائع عطا نہیں کیے" میرے نزدیک استدلال کی بہ نسبت جھنجلاہٹ کی شان زیادہ رکھتا ہے۔ گویا آپ خالق کو اس بات کی سزا دینا چاہتے ہیں کہ اس نے آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب پا لینے کے قابل کیوں نہ بنایا، اور وہ سزا یہ ہے کہ آپ اسے اس بات کا الزام دے دیں گے کہ تیری پالیسی میں جھول ہے۔ اچھا، یہ سزا آپ اس کو دے دیں۔ اب مجھے بتائیے کہ اس سے آپ کو کس نوعیت کا اطمینان حاصل ہوا؟ کس مسئلہ کو آپ نے حل کر لیا؟ اس جھنجلاہٹ کو اگر آپ چھوڑ دیں تو بآسانی اپنے استدلال کی کمزوری محسوس کر لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال کرنے کے لیے جس قابلیت کی ضرورت ہے، جواب دینے یا جواب پانے کے لیے وہ قابلیت کافی نہیں ہوتی۔ خالق نے سوچنے کی صلاحیت تو آپ کو اس لیے دی ہے کہ اس نے آپ کو "انسان" بنایا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے جو مقام آپ کو دیا گیا ہے اس کے لیے یہ صلاحیت آپ کو عطا کرنا ضروری تھا۔ مگر اس صلاحیت کی بنا پر جتنے سوالات کرنے کی قدرت آپ کو حاصل ہے ان سب کا جواب پانے کی قدرت عطا کرنا اس خدمت کے لیے ضروری نہیں ہے جو مقام انسانیت پر رہتے ہوئے آپ کو انجام دینی ہے۔ آپ اس مقام پر بیٹھے بیٹھے ہر سوال کر سکتے ہیں، لیکن بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب آپ اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ مقام انسانیت سے اٹھ کر مقام الوہیت پر نہ پہنچ جائیں، اور یہ مقام بہرحال آپ کو نہیں مل سکتا۔ سوال کرنے کی صلاحیت آپ سے سلب نہیں ہو گی، کیونکہ آپ انسان بنائے گئے ہیں، پتھر یا درخت یا حیوان نہیں بنائے گئے ہیں۔ مگر ہر سوال کا جواب پانے کے ذرائع آپ کو نہیں ملیں گے، کیونکہ آپ انسان ہیں، خدا نہیں ہیں۔ اسے اگر آپ خالق کی پالیسی میں "جھول" قرار دینا چاہیں تو دے لیجیے۔

حدیث اور توہینِ صحابہؓ

سوال: بخاری (کتاب الانبیاء) میں حضرت ابن عباس کی روایت کا ایک حصہ یہ ہے وان اناساً من اصحابی یوخذ بہم ذات الشمال فاقول اصحابی اصحابی فیقول انھم لم یزالوا مرتدین علی اعقابھم منذ فارقتھم فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیھم شہیداً ما دمت فیھم الی قولہ الحکیم۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن "میرے بعض اصحاب" کو بائیں طرف سے گرفتار کیا جائیگا تو میں کہونگا (انہیں کچھ نہ کہو) یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب ملیگا کہ تیری وفات کے بعد یہ لوگ الٹی چال چلے۔ اس کے بعد میں حضرت عیسیٰ کی طرح کہونگا کہ خداوندا! جب تک میں ان میں موجود رہا ان کے اعمال کا نگران رہا لیکن جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کا رقیب تھا۔

اس روایت سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین اور تحقیر مترشح ہوتی ہے کیا یہ روایت صحیح ہے؟

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہیں مجرم کی حیثیت سے فرشتے قیامت کے دن بائیں طرف سے گرفتار کریں گے اور یہ کہ انہوں نے دنیا کی زندگی میں سرور دو عالم کی وفات کے بعد آپ کے طریقہ کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کی، اصحاب سے مراد جناب کے صحابہؓ ہی ہیں اس کے قرائن یہ ہیں۔

۱۔ لفظ اصحاب خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جنہوں نے آپ کی زندگی میں ایمان کے ساتھ آپ کا تعاون کیا اور آپ کی رفاقت اختیار کی انہیں اصحاب کا لقب دیا گیا۔

۲۔ ایک روایت میں خود حضور صلعم نے تصریح فرمائی ہے کہ وابستہ جماعت صحابہ! تم میرے اصحاب ہو اور جو اہل ایمان تمہارے بعد آنے والے ہیں، ہمارے اخوان ہیں۔

۳۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت، بزرگی اور منقبت کے سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان میں بھی اصحاب کا اطلاق صحابہ کرام پر ہے۔ اصحابی کالنجوم تو مشہور حدیث ہے۔

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احتجاج پر فرشتے جواباً عرض کریں گے کہ "آپ کے جدا ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے آپ کے طریقہ کو چھوڑ دیا اور اپنی طرف سے نئے طریقے ایجاد کر لیے۔ حدیث لاتدری ما احدثوا بعدک (مشکوٰۃ) کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جب تک آپ زندہ رہے تو یہ لوگ آپ کے وفادار ساتھی کی طرح آپ کے دین کے پیروکار رہے لیکن جوں ہی آپ نے اس عالم ناسوت کو چھوڑا تو انہوں نے پھر دین میں رخنے ڈالنے شروع کیے۔

۵۔ پھر آنجناب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معذرت فرمائیں گے۔

ان قرآنی الفاظ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ معاملہ حضور کے اصحاب کا ہے۔

جواب۔ امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب الانبیاء میں دو جگہ ابن عباس کے حوالہ سے روایت کی ہے۔ ایک باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً میں۔ دوسرے باب واذکر فی الکتاب مریم میں۔ اس کے علاوہ اسی مضمون کی متعدد احادیث انہوں نے کتاب الرقاق، باب فی الحوض میں انس بن مالک، سہل بن سعد، ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہیں۔ ان سب کو جمع کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

(۱) یہ معاملہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اصحاب کے زمرے میں شمار ہوتے تھے، مگر آپ کے بعد مرتد ہو گئے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ انھم لن یزالوا مرتدین علی اعقابھم منذ فارقتھم (یہ آپ کے جدا ہونے کے بعد الٹے پلٹ گئے تھے اور پلٹے رہے، یعنی مرتد ہونے کے بعد پھر انہوں نے توبہ نہ کی)۔ دوسری روایت میں ہے کہ انھم ارتدوا علی اعقابھم القھقری، او علی ادبارھم القھقری (وہ الٹے پھر گئے تھے، یعنی جس کفر سے آئے تھے اسی کی طرف واپس چلے گئے)۔

(۲) یہ معاملہ ان لوگوں سے بھی متعلق ہے جنہوں نے حضور کے عہد میں اسلام تو قبول کر لیا تھا، مگر بعد میں بری روش اختیار کر لی، چنانچہ متعدد روایات میں ہے کہ لاتدری ما احدثوا بعدک، اور انک لاعلم لک بما احدثوا بعدک (آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا)۔

دونوں صورتوں میں معاملہ بعض اصحاب سے متعلق ہے نہ کہ تمام اصحاب سے۔ ظاہر ہے کہ حضور کے زمانے میں جن لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ آپ کے اصحاب میں شمار ہوتے تھے مگر انہی میں سے کچھ لوگ

وہ بھی تھے جنہوں نے فتنۂ ارتداد میں حصہ لیا اور اسی حالت میں جان دی۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں کچھ لوگ ایسے ہوں جنہوں نے منافقانہ اسلام قبول کیا ہو اور اپنے نفاق کو چھپائے رکھا ہو۔ اپنے اصحاب میں ایسے لوگوں کی موجودگی کا امکان فرض کرکے اگر آپ نے کچھ باتیں بطور تنبیہ ارشاد فرمائی ہوں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے اور اس سے تمام صحابہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مذکورہ بالا احادیث دراصل اسی تنبیہ کے قبیل سے ہیں اور ان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان کی حفاظت نہ کریں گے یا کبائر میں مبتلا ہوں گے انہیں آخرت میں محض شرف صحبت خدا کی گرفت سے نہ بچا سکے گا۔

نظریہ نسخ آیت مع بقائے حکم

پر

استدراک

[رسالہ "ترجمان القرآن" بابت ماہ نومبر ۱۹۵۵ء کے عنوان "رسائل و مسائل" کے تحت آیتِ رجم اور نظریۂ نسخ آیت مع بقائے حکم" کے متعلق جو جواب تحریر کیا گیا تھا، اسے دیکھ کر ایک صاحب نے ذیل کا مکتوب روانہ فرمایا ہے، جو ان کے حسب ارشاد شائع کیا جا رہا ہے۔]

"جواب میں جو عقلی و نقلی مواد آپ نے پیش کیا ہے وہ ایک سمجھدار اور منصف مزاج آدمی کے لیے نہایت تسلی بخش ہے۔ مگر چونکہ آپ نے دیگر اصحاب علم سے بھی اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے کا مطالبہ فرمایا ہے، اس لیے حسب الارشاد چند مختصر گزارشات درج ذیل ہیں۔

(۱) نسخ آیت مع بقائے حکم کا نظریہ بعض اصولیوں کی انفرادی رائے ہے نہ کہ تمام علمائے اہل سنت کا متفقہ عقیدہ۔ جیسا کہ آپ کے پیش کردہ حوالہ "روح المعانی" جلد اول ص ۳۱۵ سے ثابت ہوتا ہے یعنی "و نسخ الآیۃ علی ما ارتضاہ بعض الاصولیین" الخ۔ ایسی صورت میں سائل کا یہ کہنا کہ "سلف سے خلف تک تمام علمائے اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو منسوخ ہے لیکن حکم ان کا باقی ہے" محض ایک دعویٰ بلا دلیل بلکہ غلط بیانی ہے کیونکہ بعض اصولیوں کے کسی خاص نظریہ سے کل علمائے اہل سنت کا

عقیدہ لازم نہیں آتا۔

(۲) رہی یہ بات کہ آیا بعض اصولیوں کا یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط؟ سو واضح ہو کہ یہ نظریہ عقلاً و نقلاً باطل ہے:
(ل) عقلاً تو اس لیے باطل ہے کہ جو چیز قرآن کا جُز ہی نہ ہو اُس کو قرآنی حکم ماننا سراسر مُہمل بلکہ ایک مُضحکہ خیز بات ہے۔ یہ ایسا ہی ایک بے بنیاد تخیّل ہے جیسا قرآن کے چالیس پارے ہونے کا۔

(ب) نقلاً اس لیے کہ اس نظریہ سے تنقیصِ قرآن لازم آتی ہے۔ کیونکہ ایک باقی الحکم آیت کا قرآن میں نہ پایا جانا قرآن کے ناقص اور ادھورا ہونے کو مستلزم ہے۔ حالانکہ قرآن کی تنقیص بالاتفاق کفر اور آیتِ "الیوم اکملت لکم دینکم" کے صریحاً خلاف ہے۔

(۳) زنا کے متعلق شریعت کا حکم اور قانون یہ ہے کہ غیر شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سو کوڑے لگائے جائیں خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان۔ اور شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کیا جائے خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ یہ ایک مشہور و اجماعی قانون ہے جو سنتِ نبوی، سنتِ خلفائے راشدین اور اجماعِ امت سے ثابت ہے بلکہ غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا قرآن سے بھی ثابت ہے کیونکہ آیتِ "الزانی والزانیۃ فاجلدوا" الخ میں بدلیل سنتِ قطعیہ الف لام عہد خارجی ہے۔ جس سے مراد صرف غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ ہی ہیں۔ ایسے مشہور و معروف اور اجماعی قانونِ شریعت کے مقابلے میں اوّل تو سائل کی پیش کردہ حضرت عمرؓ والی تقریری روایت ساقط الاعتبار ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ جیسے اعلیٰ مجتہدِ شریعت کی طرف ایسے مشہور و اجماعی قانون کی خلاف ورزی کا منسوب کرنا ہی بعید از قیاس ہے۔ اگر بالفرض اس نسبت کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو ایک مشہور و اجماعی قانون کے مقابلے میں حضرت عمرؓ کی یہ رائے اُن کی ایک انفرادی اور اجتہادی رائے قرار پائے گی۔ جو کسی غیر نبی کے بارے میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ "المجتہد یخطی و یصیب"